

## حسن عابدی کی ادبی خدمات کا جائزہ Review of Hassan Abidi's Literary Aspects

<sup>1</sup> اللہ دتہ <sup>2</sup> ڈاکٹر فرزانه کوبک

### Abstract:

*Hassan Abidi's personality and art are also multifaceted, like any great creator. His commitment to the progressive movement and role in its organizational activities is a bright chapter of his Kitab-e-Hayat. The basis of this opinion is based on the unique features and styles of Hassan Abidi's poetry. To a large extent, he has not allowed the traditional essentials of the ghazal to influence objective commitment and realism and has avoided molds and bandhi tiki techniques and symbols. The common vocabulary of the ghazal, compounds, metaphors, epithets, and allusions have been completely avoided. As a result, he transforms the traditional obsolescence of Ghazal into a new idea, a new concept, and new imagery, and he also gives his Ghazal a new look with fresh creativity and skill in terms of words, techniques, vocabulary, and art style. One of the strengths of Hassan Abidi's translations is the linguistic aspect of these translations. The translated text is translated with a fluent, simple, and natural flow. They do not use unfamiliar words in translation. Idioms, proverbs, similes, and metaphors are also avoided. Their sentences are short and complete; rather than deriving their favourite meanings from the original text, they express the main point in a simple way. As a journalist, writer, poet, and political activist, Hassan Abidi enlightened society and the consciousness of his era with rationalism and philanthropy. He taught enlightenment through his writings and poetry.*

**Keywords:** Hassan Abidi, Progressive, Philanthropic, Rationalist, Imagery.

حسن عابدی کی شخصیت اور فن بھی کسی عظیم تخلیق کار کی طرح ہمہ جہت ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور اس کی تنظیمی سرگرمیوں میں کردار ان کی کتاب حیات کا روشن باب ہے۔ اس رزلے کی بنیاد حسن عابدی کی شاعری کی منفرد خصوصیات اور اسلوب پر ہے۔ کافی حد تک انہوں نے غزل کے روایتی لوازم کو معروضی وابستگی اور حقیقت پسندی پر اثر انداز نہیں ہونے دیا ہے اور سانچوں اور باندھی روایتی تراکیب اور علامتوں سے گریز کیا ہے۔ غزل کے عام الفاظ، مرکبات، استعارات مکمل گریز کیا گیا ہے۔ نتیجتاً وہ غزل کے روایتی فرسودہ پن کو ایک نئے خیال، نئے تصور، نئے منظر نگاری میں ڈھالنے میں اور الفاظ، تراکیب، لفظیات، فن اسلوب کے حوالے سے تازہ تخلیقی صلاحیتوں اور مہارت کے ساتھ اپنی غزل کو ایک نیا روپ بھی دیتے ہیں۔ بطور مترجم حسن عابدی کے تراجم کی بنیادی خوبی ان کا لسانی پہلو ہے۔ وہ ترجمے میں غیر مانوس الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ محاورات، تشبیہات اور استعارات سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ان کے جملے مختصر اور مکمل ہوتے ہیں، اصل متن سے اپنے پسندیدہ معنی اخذ کرنے کے بجائے وہ مرکزی نکتے کو سادہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ایک صحافی، ادیب، شاعر اور سیاسی کارکن کی حیثیت سے حسن عابدی نے اپنے عہد کے معاشرے اور شعور کو عقلیت پسندی اور انسان دوستی سے روشن کیا۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور شاعری کے ذریعے روشن خیالی کا درس دیا۔

کلیدی الفاظ: حسن عابدی، ترقی پسند، انسان دوستی، تعقل پسندی، امیجری۔

حسن عابدی کی ادبی زندگی کم و بیش چھ دہائیوں پر محیط ہے۔ بقول خود ان کے شعر گوئی کی ابتدا انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں غزل لکھنے سے کی۔ آج حسن عابدی ادب کی دنیا کا ایک معتبر اور ممتاز نام اور حوالہ ہیں۔ ہر چند کہ وہ ایک ایسی شخصیت ہیں جن سے حلقہ فکر و دانش اور دائرہ علم و ادب سے وابستہ

<sup>1</sup> اسکالر پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

<sup>2</sup> صدر نشین، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔ (Corresponding Author)

لوگ ایک عرصے سے استفادہ کرتے آئے ہیں، اُن کی ذات کے حوالے سے یہ کہنا کہ آفتاب آمد دلیل آفتاب کوئی نادرست بات نہیں۔ ۱۹۳۹ء میں پاکستان میں اُن کی آمد سے اُن کی سیاسی زندگی شروع ہوئی تھی اور وہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے وابستہ ہو گئے اور مشکل ترین عہد میں پارٹی کے سیکرٹری جنرل سید سجاد ظہیر کے ساتھ مصروفِ عمل رہے اور قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہوئے۔ اُن کا یہ شعر، جو زباں زدِ خاص و عام ہے، اس دورِ دار و گیر کا ترجمان ہے۔

کچھ عجب بوئے نفس آتی ہے دیواروں سے

ہائے! کیا لوگ تھے زنداں میں بھی ہم سے پہلے!

اس شعر میں جس نظریاتی زندگی اور تخلیقی زندگی کی ہم سفری بلکہ ہم نفسی کا جمالیاتی اظہار ملتا ہے، اس ہم سفری اور ہم نفسی میں کسی موڑ اور مرحلے پر اُن کے ہاں سرِ موبعد پیدا نہیں ہوا۔ اپنے تخلیقی سفر میں اس کٹ منٹ کا اعادہ اُن کے تازہ ترین شعری مجموعے 'فرار ہونا حروف کا' کے ان جملوں میں کیا گیا ہے:

”میں نے شعر کہنے کی ابتدا غزل سے کی، اُس کے بیش تراشعار میں میرا تجربہ بہت کم شامل ہوتا تھا۔ گرد و پیش کی دنیا اور اُس کے معاملات کو غزل میں سمونے کی کوشش میرے لیے تسلی بخش نہ تھی۔ بالعموم یہ ہوتا کہ میں کہنا کچھ چاہتا اور ردیف اور قوافی مجھے گھیر گھاڑ کر کسی اور طرف لے جاتے۔ غزل نے کئی صدیوں تک ہمارے مزاج شعری پر حکمرانی کی ہے۔ اس نے ہمیں کنائیوں اور استعاروں میں گفتگو کا سلیقہ سکھایا ہے۔ زیر لب کلام کرنے بلکہ چشم و ابرو سے ہی اپنا مدعا دوسروں تک پہنچانے کا ہنر بھی اس کی دین ہے، صدیوں تک ضرورت بھی اس سلیقے اور قرینے کی تھی۔ جب بادشاہ اور اُس کے درباری قادرِ مطلق ہوں، جاگیر دار زمین پر خدا بن کر بیٹھے ہوں، جب زمینی اور آسانی مصائب کی یورش ہو، فاتح لشکر بستیوں کو آگ لگانے اور گھروں کو آزادانہ لوٹنے پر قادر ہوں، زندگی سے اعتماد اٹھ چکا ہو، شخہ اور کوتوال، محتسب اور مخبر دندناتے پھر رہے ہوں اور ایک حرفِ ناروا بھی موت کی سزا بن جائے تو احتجاج کے لیے بھی غزل کا پیرایہ ہی اختیار کیا جاسکتا تھا کہ ناہنجار حاکم بھی فلکِ ناہنجار کی شکایت سن کر مسکرا دے۔“ [۲]

غزل کے محدودات کے بارے میں حسن عابدی کی رائے کی صداقت پر شبے کی کیا گنجائش ہے، مگر غزل نے بیسویں صدی میں خاص طور پر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو ارتقائی سفر طے کیا ہے، اُس کی روشنی

میں بات آگے بڑھائی جاسکتی ہے لیکن حسن عابدی کی رائے کو رد کر کے نہیں بلکہ کسی اور زاویہ نظر سے۔ بہر حال انھوں نے اپنے تیسرے مجموعے میں، جو تمام تر نظموں پر مشتمل ہے، اپنی نظم گوئی کی ضرورت کے باب اور دو ٹوک بات کہی ہے جس سے اُن کی فکر و نظر اور ادب کے سماجی کردار کے بارے میں اُن کی رائے کھل کر سامنے آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

”ہمارا زمانہ اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود قوموں کی برابری، جمہوری حقوق انسانی کی سر بلندی اور پاس داری اور شہری آزادیوں کا زمانہ ہے۔ ایسے میں جب میں اپنے گرد و پیش انسانی حقوق کو پامال ہوتے دیکھتا ہوں، جب محکوم قوموں کو جہد آزما اور حریت پسندوں کو، خواہ وہ دنیا میں کہیں بھی ہوں، آزادی کے لیے اپنی جانیں نثار کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرے بدن میں لہو کی گردش تیز ہو جاتی ہے اور اُن ظالموں کے خلاف اپنی نافرمانی کا اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ بس میری نظم نگاری کا یہی جواز ہے۔“ [۳]

صنفِ غزل پر صنفِ نظم کو حسن عابدی نے جو فوقیت دی ہے غزل سے یہ شکایت نئی نہیں، اس کی ابتدا مرزا غالب سے ہوئی تھی جب غالب نے کہا تھا:

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگناے غزل  
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر غزل کے دامن میں ایسی وسعت پیدا ہو گئی کہ حالی اور کلیم الدین احمد کے اعتراضات کی معنویت جاتی رہی، خاص طور پر مجروح اور فیض نے غزل میں وہ سب کچھ کر دکھایا ہے جو نظم کا خاصہ ہے۔ حسن عابدی کی غزل کے حوالے سے ایک اہم رائے جناب خلیق ابراہیم خلیق کی ہے جو لائق توجہ ہے:

”مجھے حسن عابدی کی غزلیں اُن کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ ترانا لگیں اُن کی غزل کا اپنا ایک اسلوب ہے جس پر ترقی پسند غزل کے بڑے شاعروں یعنی فراق، مجاز، فیض، جاں نثار، اختر، جذبی، مجروح، ظہیر کاشمیری میں سے کسی کا بھی پرچھانواں نہیں پڑا ہے۔“ [۴]

اس رائے کی اساس بنیاد ہی حسن عابدی کی غزلوں کی منفرد خصوصیات اور اسالیب پر استوار ہے۔ انھوں نے بہت حد تک غزل کے روایتی لوازم کو معروضی وابستگی اور حقیقت نگاری پر اثر انداز نہیں ہونے دیا

ہے اور ڈھلے ڈھلائے سانچوں اور بندھی ٹکی تراکیب و علامات سے احتراز کیا ہے؛ غزل کی عام لفظیات، مرکبات، استعاروں، کنایوں اور تلمیحات سے قطعی گریز کیا ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ غزل کی روایتی فرسودگی کو نئے خیال، نئے تصور، نئی ایجمری میں بدل دیتے ہیں اور الفاظ، تراکیب، لفظیات، اسلوب فن میں بھی تازہ کارانہ خلاقیت اور ہنرمندی سے اپنی غزل میں نیا روپ دیتے ہیں۔

حسن عابدی کی تخلیقی اور ذاتی زندگی میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے، سواں باب میں یہ کہنا برحق ہوگا کہ فن اور شخصیت کی یک جانی جو ان کے ہاں ملتی ہے، وہ بھی ان بہترین روایات کی حامل ہے۔ ظالموں کے خلاف اپنی نفرت کا وہ اعلان تخلیقی زندگی کے آغاز سفر سے کیا، یہ اعلان کبھی عملی جدوجہد کے ذریعے ہوا، کبھی نثری نگارشات خاص طور پر ”لیل و نہار“ میں شامل تحریروں میں ہوا اور کبھی پیکرِ شعر میں۔ گویا ظلم و جبر و استحصال کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے اور مصروفِ جنگ رہتے ہوئے انھوں نے جو زندگی بسر کی ہے، وہ قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ اس تناظر میں پہلے شعری مجموعے ”نوشتِ نئے“ میں تحریر کردہ اُن کا یہ جملہ میرے نزدیک محلِ نظر ہے کہ ”۱۹۷۰ء کی دہائی اور اُس کے بعد میں جو کچھ لکھا، وہ ایک واضح سماجی شعور کی روشنی میں لکھا۔“ اُن کا واضح سماجی شعور روزِ اول سے اُن کا رہبر و رہنما تھا اور کبھی کسی مرحلے پر بھول بھلیوں میں وہ نہیں گھرے اور نہ کبھی Ideological Confusion کا کوئی سراغ اُن کی زندگی اور فن میں ملتا ہے۔ اُن کے سماجی شعور کا سرچشمہ مارکسزم رہا ہے۔ حسن عابدی کے سماجی شعور کا جو اظہار اُن کی شاعری میں ہوا ہے، اس حوالے سے یہ کہنا ناگزیر ہے کہ حسن عابدی شاعری کے پردے میں شاعری کی پُراسراریت اور اشاریت کے ساتھ اس شعور کا تخلیقی سطح پر اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ شعر اپنے فکر و خیال کے ساتھ پڑھنے والے کے احساس کا حصہ بن کر اُس کے دل میں اُتر جاتا ہے اور اُس سماجی شعور کے دیے خود اُس کے اندر روشن کر دیتا ہے، اسی لیے اُن کی شاعری میں تازگی، توانائی اور اثر آفرینی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ حسن عابدی کے یہاں سماجی شعور دراصل وہ شعور ہے جو انسان کو سماج میں یکساں انصاف فراہم کرنے کا درس دیتا ہے جو جبر و استحصال کے خلاف جذبہ و خیال کو پیدا کرتا ہے، خیر کی قوتوں کی حمایت کرتا ہے اور شر کی قوتوں کو چیلنج کرتا ہے۔ یہ شعور اُن کی غزلوں میں بھی عیاں ہے اور نظموں میں بھی۔

جناب حسن عابدی کی شخصیت کی تعمیر میں جن عناصر کی کارفرمائی رہی ہے، اُن میں سچائی سادگی،

عجز و انکسار اور خلوصِ فکر و نظر کو اساسی حیثیت کا درجہ حاصل ہے۔

حسن عابدی کے فن اور اُن کی شاعرانہ عظمت کے باب میں اُن کے مذکورہ تینوں شعری مجموعوں کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج اُن کو ہم عصر ترقی پسند جدید شاعروں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ اُن کی شعری تخلیقات جو ۱۹۹۰ء کی دہائی سے سامنے آئی ہیں، اُن میں وہ شعری محاسن اور جمالیاتی خصوصیات ہیں جو انھیں ترقی پسند تخلیق کار ہونے کے ساتھ جدید شاعر کے منصب پر فائز کرتی ہیں۔ ”نوشتِ نے“ کی ابتدائی غزل ملاحظہ ہو:

امید کا باب لکھ رہا ہوں  
وہ شہر تو خواب ہو چکا ہے  
اشکوں میں پرو کے اُس کی یادیں  
وہ چہرہ تو آئینہ نما ہے  
صحرا میں و فورِ تنگی سے  
لمحوں کے سوال سے گمراہوں  
سب اُس کے کرم کی داستانیں  
پتھر پہ گلاب لکھ رہا ہوں  
جس شہر کے خواب لکھ رہا ہوں  
پانی پہ کتاب لکھ رہا ہوں  
میں جس کو حجاب لکھ رہا ہوں  
سائے کو سحاب لکھ رہا ہوں  
صدیوں کا جواب لکھ رہا ہوں  
میں زیرِ عتاب لکھ رہا ہوں<sup>۵</sup>

”نوشتِ نے“ کی بیش تر غزلیں اسی لہجے اور فضا کی ہیں۔ ان غزلوں میں موضوعیت اور معروضیت اس قدر ایک دوسرے میں مدغم ہیں کہ ان غزلوں میں تجربے اور مشاہدوں کی یکساں کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہ غزلیں جس دور کی تخلیقات ہیں، یہ وہ دور ہے جب بین الاقوامی سطح پر ایک طرف سرد جنگ کی کش مکش ہے تو دوسری طرف سوویت یونین کی شکست و ریخت کے آثار جو گورباچوف کی حکمتِ عملیوں

کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو رہی تھی۔ ملکی سطح پر جمہوریت کشی کی جو جلوہ گرمی ضیاء الحق کے دور میں نظر آئی، شہری حقوق اور شرفِ بشر کی جو بے توقیری دیکھنے میں آئی، یہ سب کچھ جناب حسن عابدی کے شعور اور ادراک کے پردوں پر ہویدا ہوا اور اُن کی حسیت میں داخل ہوتا رہا۔ شہر نگاراں کراچی کی بڑھتی ہوئی بے چہرگی اور بے چینی، اس تناظر میں ان غزلوں کا مطالعہ کیجئے تو غزلوں کے بیش تر اشعار شہر آشوب نظر آئیں گے:

چاند نکلے گا تو ویرانے میں گھر بن جائے گا  
دیکھنا! اب شہر میں جو بھی دیا روشن ہوا  
منزلیں نزدیک آ کر نارسا ہو جائیں گی  
میرا سایہ میری خاطر بام و در بن جائے گا  
رات ہونے تک اندھیرے کی سپر بن جائے گا  
فاصلہ کچھ دور چل کر ہم سفر بن جائے گا

شہر ناپرساں میں کچھ اپنا پتا ملتا نہیں  
فصل گل ایسی کہ ارزاں ہو گئے کاغذ کے پھول  
ایک سناٹا ہے شبنم سے شعاع نور تک  
بام و در روشن ہیں لیکن راستا ملتا نہیں  
اب کوئی گل پیر ہن، زریں قبا ملتا نہیں  
اب کوئی آئینہ پس موج صبا ملتا نہیں

دل کی دہلیز پہ جب شام کا سایہ اترا  
سب امیدیں مرے آشوبِ تمنا تک تھیں  
رات آئی تو اندھیرے کا سمندر امڈا  
افتِ درد سے سینے میں اجالا اترا  
بستیاں ہو گئیں غرقاب تو دریا اترا  
چاند نکلا تو سمندر میں سفینا اترا

گل افشانی صبا کی ہے نہ تابانی سبو کی ہے  
شراروں کے سوا اب کیا رہا ہے راکھ کے گھر میں  
یہ تنہا چاند، یہ آفاق کا پُربول سناٹا  
مگر یہ کیا کہ ہر کوچے میں ارزانی لہو کی ہے؟  
یہ وہ بستی ہے جس نے روشنی کی آرزو کی ہے  
یہ میت کھر میں لپٹی ہوئی کس ماہ رو کی ہے؟

”نوشتِ نے“ کی غزلوں میں احساسِ کرب کی ایک ایسی سطح پائی جاتی ہے جس کی تخلیقیت کا اظہار مشاہدے میں تجربے کی شمولیت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ کربِ احساس اور اس کی کارفرمائی صرف اُن کی غزلوں تک محدود نہیں بلکہ ”نوشتِ نے“ کی بیش تر نظموں میں یہ لہریں اسی طرح موج زن نظر آتی ہیں۔ اُن کی شعری جمالیات کی جلوہ سامانیاں اُن کی غزلوں اور نظموں میں ایک جیسی ہیں اور ”نوشتِ نے“ کی ابتدائی تخلیقات سے لے کر آخری تخلیقات میں یہی کیفیت نمایاں ہے۔ حسن عابدی کی شاعری میں پختہ کاری کے ساتھ تازہ کاری کی ہم سفری نظر آتی ہے۔ کلاسیکیت کی روایات سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے

جدید طرز احساس کو اپنے فن کا حصہ بنانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، یہ وصف ”نوشتِ نے“ میں ہر جگہ عیاں ہے۔

”نوشتِ نے“ میں غزلوں کے مقابلے میں نظموں کا غلبہ نمایاں ہے۔ بیش تر نظمیں ہیئت کے اعتبار سے Free Verse یعنی آزاد نظم کی حیثیت کی ہیں۔ ہم عصر زندگی کا کوئی گوشہ نہیں جس پر حسن عابدی کی نگاہ اور توجہ نہ ہو۔ گرد و پیش کی زندگی اُن کی نظموں کا موضوع بنتی رہی ہے۔ یہ گرد و پیش کی زندگی گھر سے شروع ہو کر کرہ ارض تک پھیلی ہوئی ہے۔ ”نوشتِ نے“ کا مطالعہ کرتے وقت بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حسن عابدی نظم کی طرف ہمیشہ زیادہ متوجہ رہے ہیں اور اپنے مافی الضمیر کا بیان انھوں نے نظموں میں زیادہ موثر اور بہتر ابلاغ کے ساتھ کیا ہے، لہذا تیسرے مجموعے میں نظم گوئی کے حق میں اُن کا اعلان نامہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یہی صورتِ حال اُن کے دوسرے شعری مجموعے ’جریدہ‘ میں بھی نظموں کا غلبہ ہے، ہر چند کہ غزل کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کی رائے ہے کہ حسن عابدی دونوں اصناف، غزل اور نظم پر حاوی ہے، مگر اُس کے تخلیقی جوہر غزل ہی میں کھلتے ہیں۔ اُن کے دوسرے شعری مجموعے ’جریدہ‘ میں شامل پہلی تخلیق ’دعا‘ ہے، اُس کے آخری مصرعے ملاحظہ فرمائیے:

آؤ! دعا کو ہاتھ اٹھائیں

دونوں خالی ہاتھ

یارب! میرے پاے ثبات کو چلتے رہنے کی

توثیق عطا کر

راہ میں تھک کر بیٹھ نہ جاؤں

پاؤں کو وہ زنجیر عطا کر

بیاس کا صحر اہانپ رہا ہے، زم زم کی تاثیر عطا کر

ریگ بیاباں دینے والے!

تلوے چھلنی ہو لینے دے

چھالوں کی جاگیر عطا کر [۱۰]

اس دعا میں جہدِ حیات کی استقامت کا جو توانا اظہار شعری پیکر میں ملتا ہے، اس سے میرے اس موقف کو تقویت ملتی ہے کہ حسن عابدی کے یہاں تخلیقی سفر میں عمل ارتقا کی کارفرمائی جاری و ساری

رہی۔ انھوں نے ہیئت میں جدید روایات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ترقی پسندانہ نظریہ حیات اور نظریہ فن کے لیے نئی توانائیاں اور بلندیاں حاصل کی ہیں جو خود ترقی پسند شاعری کے اعتبار اور معیار کے فروغ میں معاون و مددگار ثابت ہوں گی۔ اُن کے تازہ ترین شعری مجموعے فرار ہونا حروف کا میں تمام تر نظمیں غیر پابند یعنی Free Verse کے فارم میں ہیں موضوع اور مواد کے لحاظ سے ہم عصر زندگی کو درپیش Challenges کے موضوعات پر اس مجموعے میں شامل نظمیں بیک وقت جدید بھی ہیں، ترقی پسند بھی۔ پہلی نظم 'پچھلی صدی کی آخری شام' ہے۔ یہ مختصر نظم اس شعری مجموعے کے جمالیاتی حسن اور قرارِ محبت کی نمائندگی کرتی ہے:

مہ و انجم بھی وہی، رات کا سفر بھی وہی  
 دیارِ صبح وہی، دن کی رہ گزر بھی وہی  
 ہزار بار یہ جلوے ادھر سے گزرے ہیں  
 تمام نقش کسی حسن لازوال کے ہیں  
 اسیر ایک طلسماتِ ماہ و سال کے ہیں  
 گزرتے لحو! ذرا پل کے پل ٹھہر جاؤ  
 ہم ایک سال میں صدیاں گزار آئے ہیں  
 یہ ایک شام، اسے آنکھ بھر کے دیکھ تو لیں  
 کہ اس میں عکس کسی پیکرِ جمال کے ہیں"

حسن عابدی کے تیسرے مجموعے کی بہت سی نظمیں اپنے اچھوتے اندازِ بیاں کے ساتھ تخلیق کار کی وسعت نگاہ کی ترجمانی کرتی ہیں اور بدلے ہوئے حالاتِ زیست کو پیش کرتی ہیں۔ یہ بدلے ہوئے حالاتِ زیست ۱۹۹۰ء کی دہائی کے تناظر میں خصوصیت کے ساتھ نظموں کے موضوع بنے ہیں۔ سوویت یونین کے انہدام کے نتیجے میں عالمی منظر نامہ کیا بنا، صاحبِ تخلیق کی اس پر گہری نظر بھی ہے اور وہ اس سے بے حد متاثر بھی ہیں۔ W.T.O, New World Order اور Unipolar World یہ وہ موضوعات ہیں جو گزشتہ دو دہائیوں سے اہل دانش کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ حسن عابدی کے تینوں مجموعوں میں یہ نئی دنیا جس کی باگ امریکی جدید نوآبادیاتی شکلیں میں ہے اور متعدد نظمیں مذکورہ موضوعات اور مسائل پر محیط ہیں۔ اس ضمن میں اُن کی سب سے نمائندہ نظم عراق پر امریکی جارحیت کے حوالے سے ہے جس کا عنوان ہے ہلا کو! اب جو

تم بغداد آؤ گے۔ یہ نظم ملاحظہ ہو:

ہلا کو! اب جو تم بغداد آؤ گے  
یہاں لاشیں ملیں گی، لیکن اُن کے سر نہیں ہوں گے  
سروں کا اکٹ مینار تمہارے شہر میں آنے سے پہلے بن چکا ہوگا  
گلی کوچے، سرائیں، خانقاہیں، قبوہ خانے  
اپنے سائے کے مقابل ہاتھ پھیلائے کھڑے ہوں گے  
کتب خانوں کی خاکستر اُڑائی جا چکی ہوگی  
نوادر بوریوں میں بٹ چکے ہوں گے  
کلام اللہ کے نایاب نسخے اور صحیفے  
کہ جن کی دید سے تاریخ کا سینہ منور تھا، جلانے جا چکے ہوں گے  
ہلا کو! اب جو تم بغداد آؤ گے  
الف لیلہ کی راتیں داستانوں سے نکل کر  
دھوپ کی چادر لپیٹے، ریت کے ٹیلوں پہ بیٹھی  
قصہ گو یوں، تاجروں، صحرانوردوں، حدی خوانوں، سخن دانوں کا  
رستہ تک رہی ہوں گی  
کہ دیکھیں شہر میں کب رات آتی ہے  
مگر اب صبح آئے گی نہ کوئی رات آئے گی  
ہلا کو! اب جو تم بغداد آؤ گے  
علی بابا کے سونے کے خریطے، خیمہ و خرگاہ سارے لُٹ چکے ہوں گے  
جہاں عشوہ طراز و حیلہ گرمر جینار ہتی تھی  
وہاں اک اور ہی دنیا کے نو سر باز بیٹھے ہیں  
یہاں مٹی میں جادو ہے، زمیں سونا گھلتی ہے  
ہوا میں تیل کی بو ہے  
ہلا کو! اب جو تم بغداد آؤ گے  
تو پھر واپس نہ جاؤ گے [۳]

یہ نظم اردو شاعری کی بہترین روایات کی نمائندگی کرتی ہے اور عرصہ دراز تک قارئین کو اپنی

طرف متوجہ رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس زمرے میں متعدد نظمیں مذکورہ مجموعے میں شامل ہیں۔

وہ مجھ سے میری صبحیں چھین لینا چاہتے ہیں

کہ مجھ پر دن تو نکلے گا

مگر میرے لیے اُس دن کے اندر کچھ نہیں ہوگا

مری مٹی کی خوشبو، میرے موسم کی نشاط آور اُدا سی

تیار فصلوں میں ہوا کی سرسراہٹ

(مہکتی گرم فصلیں)

پرندوں کا سکوتِ سردی، اُن کے چپکنے کی صدا آئیں

وہ مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں

یہ مٹی، کھیت، جوہڑ، جھیلیں، نیلا آسمان اپنا نہیں ہوگا

وہ مجھ سے میری شامیں، روپہلا سا اُجاگر، گلابی سی فضا آئیں

چھین لینا چاہتے ہیں

وہ مجھ سے میری راتیں، میری شبنم، ماہِ پرویں، کہکشا آئیں

تھکن سے چور میری نیند، میرے خواب، اُن کی وادیاں

اور سیر گا ہیں چھین لینا چاہتے ہیں

سحر دم میرے شانوں پر، یہ میرے دست و بازو وغیرہ کے ہوں گے

مرا سینہ مرا ہوگا، مگر دل میں اردے اور کے ہوں گے

تو میں دوسروں کی زندگی کا بوجھ شانوں پر اٹھاؤں

مگر جو زندگی میں غیر کو دے کر چلا ہوں

وہ اُس کی مالیتی سلطنت کو چار دن چلنے نہیں دے گی

ہمارے موسموں کا، خاک و خون کا سب اثاثہ ہمارے پاس ہوگا [۱۳]

حسن عابدی نے اپنے سماج کے ہر گوشے پر اپنی توجہ مبذول رکھی ہے اور اُس کا اظہار تخلیقی

جمالیات کے ساتھ بھرپور انداز میں کیا ہے، یہ بات اُن کی شاعری پر مجموعی طور پر صادق آتی ہے۔

حسن عابدی ایک سنجیدہ اور منظم ترجمہ نگار ہیں۔ انھوں نے کئی دہائیوں پر مشتمل اپنے فنی سفر

میں ان کتب کو ترجمہ کے لیے منتخب کیا جو ان کے ذاتی ذوق اور مطالعے کے مطابق تھیں۔ ان میں ”بھارت کا

بحران“، رونالد سیگل، ”دشمن کی تلاش“، ضیاء میاں، افتخار احمد، ”اقبال احمد کے مضامین“، افتخار احمد، زمرہ احمد، ”آزادی سے پہلے مسلمانوں کا رویہ“، غلام کبریا، ”مذہبی فاشزم اور ریاستی دہشت گردی“، آرون دھتی رائے، ”گھامڑ گھوڑے“، مائیکل مور، ”ریاست سماجی تبدیلی اور رواداری“، اصغر علی، ”انسانی تہذیب کے پانچ ادوار“، ولیم گارکی، ”اُردو جرنلزم“ فرینک جوزی نمایاں کتب ہیں جو انھوں نے تراجم کیں۔

وہ ایک پُر امن روشن خیال لکھاری تھے۔ انھوں نے اپنی ترجمہ شدہ تحریروں سے وہ کام لیا جو وہ عمومی زندگی میں پسند کرتے ہیں ان کی زیادہ تر ترجمہ شدہ کتابیں امن، رواداری بین المذہب ہم آہنگی، بین الاقوامی اشتراک، عالمگیریت، انسانی حقوق کے تحفظ، عدل، انصاف، سماج کے پسماندہ اور مظلوم لوگوں کی حمایت اور ان کے لیے آگے بڑھنے کے مواقع تلاش کرنا، ان کی مناسب تعلیم اور ان کی ذہنی، فکری ترتیب ان کے نزدیک ہمیشہ اہم رہی ہے۔ انھوں نے ایسے متنوں کو ترجمہ کیا ہے جو ہم عصر دنیا کے بڑے ذہنوں کی تخلیق ہے اور جن کے ذریعے سماج میں مساوات قائم کی جاسکتی ہے نیز ان کے ہاں ہمیں سیاسی بصیرت اور تاریخی شعور بھی نظر آتا ہے۔

حسن عابدی نے ترجمہ کے لیے متن بند ترجمہ کے اصول کو اپنایا ہے جس میں انھوں نے اصل مصنف کے خیالات کو عین اسی انداز میں پیش کیا ہے جس طرح مصنف نے چاہا ہے۔ ان کے تراجم میں ہمیں کہیں بھی ابہام نظر نہیں آتا البتہ کچھ تراجم انھوں نے ماخوذ کیے ہیں جن کے بارے میں انھوں نے دیباچہ میں تفصیل سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ اصل متن کو عین مصنف کی منشاء کے مطابق ترجمہ کرتے ہیں لیکن کہیں پر ضروری ہو تو حواشی میں کسی لفظ یا شخصیت کے بارے میں چند سطور لکھ دیتے ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں متن مختلف حصوں میں ایک سلیقے اور قرینے سے تقسیم نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی پسند سے اور ادارہ جاتی ضرورت کے تحت بھی تراجم کیے ہیں لیکن انھوں نے ترجمہ کے معیار پر کہیں بھی سمجھوتا نہیں کیا۔ انھوں نے پوری دیانت داری سے تمام متن کو ترجمہ کیا ہے ان کے ترجمے میں سلاست اور ابلاغ کہیں پر بھی ماند نہیں پڑتا۔

حسن عابدی کے تراجم کی ایک خوبی ان تراجم کا لسانی پہلو ہے۔ ترجمہ کردہ متن رواں، سادہ اور فطری بہاؤ کے ساتھ ترجمہ ہوتا ہے۔ وہ ترجمہ میں غیر مانوس الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ محاورات،

ضرب المثل، تشبیہات اور استعارات سے بھی اجتناب برتتے ہیں۔ ان کے ہاں جملے مختصر اور مکمل ہوتے ہیں وہ اصل متن سے اپنے پسندیدہ مفاہیم اخذ کرنے کی بجائے اصل بات کو سہل انداز میں بیان کرتے ہیں۔ بعض مترجمین کے ہاں جملے اس قدر طویل ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنا فطری ربط کھو دیتے ہیں۔ حسن عابدی کے ہاں ایسا نہیں ہے وہ کہیں کہیں جملہ معترضہ کے ذریعے کسی بات کی چند لفظوں میں وضاحت کر دیتے ہیں جس سے قاری کی الجھن دور ہو جاتی ہے، حسن عابدی کے تراجم کا اسلوب نثر کا اسلوب ہے ان کے ہاں شاعری کا شائبہ بھی نہیں گزرتا۔

حسن عابدی ذریعہ کا متن اور ترجمہ شدہ زبان دونوں پر یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے دونوں زبانوں کی ثقافت کو اس طرح برتا ہے کہ کہیں بھی ہمیں ایک ثقافت اجنبی محسوس نہیں ہوتی انھوں نے حیات اور لفظوں کو ان کے مظہر کے مطابق بیان کیا ہے۔ انھوں نے ترجمہ کی زبان کو ایک عالم کی طرح برتا ہے۔ انھوں نے ترجمہ کے لیے شعوری اور منطقی انداز اپنایا ہے۔ ان کے تراجم سے حاصل ہونے والے نتائج سائنسی، شعوری، قابل اعتماد اور قابل قبول ہیں۔

حسن عابدی کی شخصیت اور فن بھی ہر بڑے تخلیق کار کی طرح کثیر الجہت ہے، اصنافِ سخن کے حوالے سے بھی اور عملی زندگی کی جدوجہد کے حوالے سے بھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور اُس کی تنظیمی سرگرمیوں میں کردار اُن کی کتاب حیات کا روشن باب ہے۔ وہ پاکستان میں منعقد ہونے والی تینوں کانفرنسوں میں نمایاں کارنامے انجام دینے والوں میں رہے ہیں۔ صحافت کے میدان میں صحافتی زندگی کی بہترین روایات کی پاس داری کے ساتھ اس شعبے کی ٹریڈ یونین تحریکوں کی قیادت و سیادت میں ساری عمر پیش پیش رہے۔ جمہوریت اور امن کی تحریکوں میں قائدانہ خدمات اُن کا طرہ امتیاز ہے۔ ماضی قریب میں قلم برائے امن کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ امن کانفرنس اور بعد میں ہونے والے مظاہروں کی تیاریوں سے لے کر کامیاب مظاہروں کی قیادت وہ کرتے چلے آئے تھے۔ ترقی پسند ادیب ہونے کے ناتے انھوں نے صحافت میں بھی سائنسی طرز و فکر کو بنیاد بنایا اور پاکستانی سماج کو روادار معاشرہ بنانے میں خاصی جدوجہد کی۔ اُن کے معاصرین میں سجاد ظہیر، حمید اختر، سبط حسن، میاں افتخار الدین، احمد ندیم قاسمی، دادا فیروز الدین، واجد بشیر، محمد علی صدیقی، سید جعفر احمد، راحت سعید جیسے نابغہ روزگار افراد شامل تھے جو خرد افروزی اور تعقل پسندی کے فروغ میں کردار ادا کرنے والے اہم حوالے ہیں۔

تحقیق کا بنیادی مقصد کسی نئی چیز کو سامنے لانا ہوتا ہے۔ یا تحقیق کے ذریعہ سے عہد گذشتہ کے علمی و ادبی سرمائے کی بازیافت ہوتی ہے تاکہ عہد حاضر کے علمی و ادبی سرمائے کو نہ صرف یہ کہ ثروت مند بنایا جاسکے بلکہ مستقبل میں تحقیق کے نئے امکانات کے در بھی وا ہو سکیں۔ حسن عابدی کا شمار ایسے نابغہ ہستیوں میں ہوتا ہے جو اپنی ذات میں ایک عہد کا حوالہ ہوتے ہیں۔ یا انکی صورت میں ایک زمانے کی تاریخ اور تاریخی حقائق قارئین کے سامنے آتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ جو کہ لسانی، مذہبی اور ثقافتی گھٹن کا شکار ہو کر انتہا پسندی اور عدم رواداری کا شکار ہو چکا ہے کو صحت مند معاشرے میں تبدیل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسے موضوعات اور شخصیات کو موضوع تحقیق بنایا جائے جس سے سائنسی طرز فکر اور رواداری کو فروغ مل سکے۔ حسن عابدی نے بطور صحافی ادیب، شاعر اور سیاسی کارکن کے سماج کو اور اپنے عہد کے شعور کو تعقل پسندی اور انسان دوستی سے روشناس کرایا۔ اپنی تحریروں اور شاعری کے ذریعہ سے انھوں نے روشن خیالی کا جو درس دیا ہے ضروری ہے کہ ان نشانات کو تحقیق کے ذریعے سے منظر عام پر لایا جائے۔ یہ ہمارے عہد کی ضرورت اور اہم تقاضا بھی ہے۔

حوالہ جات:

- ۱۔ حسن عابدی، نوشتہ نے (کراچی: پاکستانی ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ۴۹۔
- ۲۔ حسن عابدی، فرار ہونا حروف کا (کراچی: شہر زاد، ۲۰۰۴ء)، ۸۔
- ۳۔ ایضاً، ۹۔
- ۴۔ خلیق ابراہیم خلیق، ”فلیپ“، مشمولہ: فرار ہونا حروف کا (کراچی: شہر زاد، ۲۰۰۴ء)، ۲۲۔
- ۵۔ حسن عابدی، نوشتہ نے (کراچی: پاکستانی ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ۱۱۔
- ۶۔ ایضاً، ۱۹۔
- ۷۔ ایضاً، ۱۶۔
- ۸۔ ایضاً، ۷۸۔
- ۹۔ ایضاً، ۱۲۱۔
- ۱۰۔ حسن عابدی، ”دعا“، مشمولہ: جریدہ (کراچی: پاکستانی ادب پبلشرز، ۱۹۹۸ء)، ۱۱۔
- ۱۱۔ حسن عابدی، ”آخری شام“، مشمولہ: جریدہ، ۷۶۔
- ۱۲۔ حسن عابدی، ”ہلا کو اب جب تم بغداد آؤ گے“، مشمولہ: فرار ہونا حروف کا (کراچی: شہر زاد، ۲۰۰۴ء)، ۱۰۲۔
- ۱۳۔ حسن عابدی، ”ڈبلیو ٹی او“، مشمولہ: فرار ہونا حرف کا، ۵۲۔